خواب گاہ میں ریت

مبشر سعید

مبشر سعید کی شاعری روایت اور جدت کے امتزاج کا متوازن نمونہ ہے وہ شعر نہیں کہتا بلکہ پینٹنگ سی لا کے سامنے رکھ دیتا ہے، جیسے:

نیند کے سُرمئی جزیرے پر
خواب کی جھونپڑی بنائی ہے

بینچ پہ پھیلی خاموشی
پہنچی پیڑ کے کانوں تک

نپے تلے انداز میں وہ الفاظ کا استعمال اس مہارت سے کرتا ہے کہ ایک لفظ اِدھر اُدھر کرنے سے شعریت ہاتھ سے جاتی رہتی ہے۔ اب تک جو کہا جا چکا مبشر اس سے آگے کی بات کہنے کی کوشش کر رہا ہے، ورنہ لوگ ہیں کہ ابھی تک وہی پرانے مضامین دھرا رہے ہیں۔ اگر اُس نے اِسی طور محنت اور مطالعہ جاری رکھا تو بہت جلد وہ اپنی الگ پہچان بنا لے گا۔

محمد علوی
(انڈیا)

مبشر سعید نئی نسل کا وہ خوش بیاں شاعر ہے جس کی شاعری مرے دل کے بہت قریب ہے۔ وہ محبّت کے رسمی مضامین سے گریزاں نئے افق کی جست جو میں سرگرداں دکھائی دیتا ہے۔ اسی جست جو میں وہ کہیں کہیں فقیری سلسلے میں چلا جاتا ہے، یہاں تک کے اُسے محبوب بھی درویش نگاہوں والا نظر آتا ہے۔ اس دور میں جب کہ نئی نسل کے شعرا، کلام کی ارفع سطح سے فیس بک کا مقبول شاعر ہونے میں ہلکان ہوئے جا رہے ہیں مبشر سعید فیس بک پر اپنی تصویری موجودگی کے باوجود غزل کی اعلا سطح کے حصول میں کوشاں دکھائی دیتا ہے۔ میں اُسے پہلے شعری مجموعے کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

پیارے بھائی
کفیل عباس کے لیے
محبت کے ساتھ
مبشر سعید
9-6-16

خواب گاہ میں ریت

مبشر سعید

ساحل کی نرم ریت پہ سویا ہوا تھا میں
اِک لہر مجھ کو خواب میں چُھو کر گزر گئی

خوابگاہ میں ریت

مبشر سعید

مثال پبلشرز
رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد

اشاعت	:	2016
کتاب	:	خواب گاہ میں ریت
شاعر	:	مبشر سعید
ناشر	:	محمد عابد
تزئین	:	محمد زین
قیمت	:	300 روپے
مطبع	:	بی پی ایچ پرنٹرز، لاہور

Khawab Gah Mein Rait

by

Mubashir Saeed

Edition - 2016

Khwab_mgr@yahoo.com
Cell: 0345-8679348
https://www.facebook.com/poetmultan

اہتمام

مثال پبلشرز رحیم سنٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار، فیصل آباد
+92-41-2615359, 2643841, Cell:0300-6668284
E-mail: misaalpb@gmail.com

شوروم

مثال کتاب گھر، صابریہ پلازہ، گلی نمبر 8، منشی محلہ، امین پور بازار، فیصل آباد

دادا صاحب

ملک محمد شفیع بھٹہ (مرحوم)

کے نام

بہ یاد

عدیل حفیظ (مرحوم)

خزاں سے پہلے ہوا کر گئی جنھیں بے شاخ
تمام رنگ وہ اب چشمِ تر میں آتے ہیں

(نصیر ترابی)

ترتیب

بشارت اور سعادت والی غزلیں	ڈاکٹر معین نظامی	11
پیش لفظ	مبشر سعید	15
گنبدِ سبز جہاں آج سجایا ہوا ہے		17
میں نے دیکھا ہے اس کی آنکھوں میں		19
شام کی زرد اداسی میں بٹھاؤں تجھ کو		22
زرد موسم کی اذیت بھی اُٹھانے کا نہیں		24
دل نے روکا تھا مگر چھوڑ آیا		26
جو رنگ ہائے رُخِ دوستاں سمجھتے تھے		27
شب کی دیوار گرادی ہے شفق زادی نے		29
پہنا ہے اس نے شوق سے جو پیرہن سفید		31
یوں بھی چھپتا ہے بھلا، وجد میں آیا ہوا رنگ		32
جذبوں کے تن پہ آئے ہوئے زخم چھیل کے		34
خواب زدہ ویرانوں تک		35
سخت حالات میں جینے کا ہنر آتا ہے		37
ہاتھ میں ہات لیے پھرتے ہیں		39

- عجیب طور درختوں نے شب گذاری ہے 40
- عالمِ وجد سے اظہار میں آتا ہوا میں 41
- بن جاتا ہے وہ زیست کا معیار، پری زاد! 43
- میں تو بیٹھا تھا ہر اک شے سے کنارا کر کے 44
- جینا اب اور نہ دشوار بناؤ، جاؤ 45
- پہلے وہ اچانک نظر آیا، اسے دیکھا 47
- رقص کرتے ہوئے سب ہوش بھلا دیتا ہوں 49
- انکار کی لذت سے نہ اقرارِ جنوں سے 50
- جو لوگ تھے ہمارے دل و جاں کہاں گئے 51
- وصل کی روشنی آنکھوں میں بسانے کے لیے 52
- کب مری حلقۂ وحشت سے رہائی ہوئی ہے 54
- یعنی ثروت کی پیروی کرلوں 56
- دشتِ ہجراں سے محبت کو نبھاتے ہوئے ہم 58
- موسم ہے خوش گوار، مرے ساتھ چل 60
- بے خبر ہوتے ہوئے ساری خبر جانتے ہیں 62
- اُجالے سے مرا شکوہ نہیں کیا؟ 63
- جسم اور روح کے آزار بڑھانے والی 65
- آ، دیکھ، مری آنکھوں میں اک بار، مرے یار! 67
- شاعری میں ڈھال کر 68
- حقیقت ہے مگر ایسا نہیں تھا 70
- بے بہا سُرمئی اداسی میں 72
- اپنے رنگوں میں ترا عکس چھپائے ہوئے ہیں 74
- سچے سُچے جذبوں سے 75
- جب کہ ہوتا تھا اک خلا مجھ میں 77
- ہجر کی رت کا طرف دار بھی ہو سکتا ہے 79
- تیری آنکھوں میں رت جگا تو نہیں؟ 80
- تیری یادوں کو ہم اشکوں میں بھگوئے ہوئے ہیں 82
- مجھ سے یہ بات نہیں تم نے چھپانی، پانی! 84
- ہجر والوں کا طرف دار نظر آتا ہے 86
- جسم کو جسم سے ملاتا ہوں 87
- باب جب مجھ پہ کھلا قریۂ ویرانی کا 89
- نیندوں کی خواب گاہ میں کچھ خواب دھر گئی 91
- اپنی حیرت میں لا رہا ہے مجھے 92
- دشتِ ہجراں کی مسافت کو اٹھائے، مجھ میں 94
- یعنی جیون کو بھی آزار بنائے گریہ 96
- دوانہ وار، مسلسل کلام کرتے ہیں 98

- آنکھ کھولوں گا تو یادوں کے خزانے ہوں گے 100
- کہانی کی اُداسی میں لکھا ہے 102
- جو ترے قرب سے حیرانی ہے 104
- نیند کی شان بڑھائے تو مزہ آجائے 106
- اپنے دل سے تو عداوت کو بھلانا، دنیا! 108
- غم کے موسم میں اذیت نے سند جاری کری 110
- ساحلوں کو کہانی سناتا رہا، دل جلاتا رہا 112
- نیند کے باغ سے اشکوں کو اُٹھانے والے! 113
- اس سے پہلے کہ دھواں آنکھ میں آنے لگ جائے 114
- سانسوں سے سارا زنگ اتارا نہیں گیا 116
- سمندر سا رواں رکھا ہے مجھ کو 118
- جانے کس شہر سے یہ ہجر ستارا لے کر 120
- غیب کے دشت میں ہوتے ہیں ٹھکانے میرے 121
- خواب جانا ہے یا خوابوں کا سفر جانا ہے 123
- بہت فضول سی باتوں کا شور ہوتا ہے 125
- عجب طرح کے سوالوں کا جال باقی ہے 126
- میری آنکھوں سے جو اشکوں کی نمود اری ہے 127
- وحشتِ عشق کی توقیر بڑھانے کے لیے 128

بشارت اور سعادت والی غزلیں

غزل ایک ایسی بھاگاں بھری صنفِ سخن ہے جس کی تازگی وشادابی صدیوں سے خزاں کی دست بُرد سے محفوظ چلی آتی ہے اور جس جس زبان میں بھی یہ رائج ہے، اس کے تخلیقی افق پر اس کی تاب ناکی مدھم نہیں ہونے پائی۔ کبھی لفظی، معنوی یا اسلوبی سطح پر اس پر کہیں کہولت یا تھکن کے سائے پڑنے بھی لگتے ہیں تو اسے کچھ توانا آوازوں کے جاں بہ کف علم بردار نصیب ہو جاتے ہیں اور اس کی ٹہنیوں پر لفظ و معنی کی نئی روئیدگی بہارِ فکر و احساس بن جاتی ہے۔

مبشر سعیدؔ کی غزلیں پڑھ کر یہ مسرت بخش احساس ہوا کہ ایوانِ غزل پر ایک تازہ کار فکر اور منفرد لب ولہجہ دستک دے رہا ہے جسے سن کر یقیناً سب دروازے اور دریچے کھلتے چلے جائیں گے۔ غزل کا یہ تازہ دم علم بردار سخن سرائے کی کسی نمایاں مسند کا سزاوار ٹھہرے گا اور یہ کاروانِ تخلیق اسی نرم وگرم روی سے آگے سے آگے بڑھتا رہے گا۔

مبشر سعیدؔ کی شاعری کا مطالعہ ایک بھلے آدمی سے اچانک ہو جانے والی ملاقات کی طرح ہے۔ خوش گوار اور حیرت افزا، ہلکا پھلکا کر دینے والا، تر و تازہ کر دینے والا۔ اس کی شاعری جذبے اور بیان کے درمیان اعتدال اور توازن قایم رکھنے کی قابلِ تعریف مثال ہے۔ وہ نہ جذبے کو اسلوب پر حاوی ہونے دیتا ہے اور نہ اسلوب کی جکڑ بندیوں میں جذبے

کے ہاتھ پانو باندھتا ہے۔ اسلوب کو جذبے کی دھیمی آنچ پر رکھ کر اس میں تاثیر کا رس ڈالتا ہے اور بعض اوقات یہ تجربہ ایسی خوب صورت شکل اختیار کر جاتا ہے کہ انسان داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مبشر سعید کی غزلیں انتہائی دل آویز اور کشش سرشت ہیں۔ سادہ اور عام فہم۔ موضوعات وہ جو ہمہ جہت اور ہمہ گیر ہیں اور الفاظ بھی ایسے جو دیارِ شعر و سخن کی مطلوب زبان کے مرغوب الفاظ ہیں، جن لفظوں میں اہلِ دل و نظر بات سننا چاہتے ہیں۔ نہ موضوعات میں قدامت ہے نہ بیان میں کُہنگی اور فرسودگی۔ یوں جیسے روا روی میں، موج مستی میں بیٹھے دوست دل کا بوجھ ہلکا کر رہے ہوں، راز و نیاز کر رہے ہوں۔ دل کی دل سے سرگوشی اسی فردوسی اسلوب اور ملکوتی لہجے میں ہوتی ہے۔

مبشر سعیؔد کی غزلوں کی ایک خاص بات غزل کی کلاسیکی روایت کے ساتھ عاشقانہ اور عارفانہ آشنائی اور جدید اسلوب و آہنگ پر اس کی مضبوط گرفت ہے۔ وہ بڑی مہارت اور چابک دستی سے کلاسیکی شاعری کی روایتی چاشنی بڑے فطری انداز میں نئے اسالیب و آہنگ میں ڈھالتا ہے۔ یہ غزلیں پڑھتے ہوئے کہیں تصنّع یا تکلّف کا احساس نہیں ہوتا بل کہ گداخت کے عمل سے گزرا ہوا ایک بے ساختہ پن اس کی سخن طرازی میں نمایاں جھلک دکھاتا ہے۔ اس نے بعض منفرد ردیفیں اختیار کی ہیں اور انھیں محبّت اور مہارت سے نبھایا ہے۔

مبشر سعیؔد دھیمے اور باوقار لب و لہجے کا شاعر ہے۔ اس کی بحریں، الفاظ کا صوتی آہنگ اور افکار کی ترسیل سب کا سب بہت دھیما اور دیرپا تاثیر کا حامل ہے اور دھیرے دھیرے تہِ دل میں سرایت کر جانے والا۔ اس کے خمیر میں احتجاجی شعلگی بھی ہے مگر وہ احتجاج کرتا ہے تو شکوہ و شکایت اور داد و فریاد کے رنگ میں نہیں بل کہ درویشانہ خود کلامی کے انداز میں کرتا ہے، جس میں بجائے خود بہتر مستقبل کی بشارت پنہاں ہوتی ہے۔

مبشر سعیؔد کی غزلیں تہ دار ہیں اور جہت در جہت۔ البتہ ان کی دو سطحیں بہت نمایاں ہیں: ایک ان کی ظاہری شکل و صورت جو دل کو لبھانے والی ہے، اپنی طرف بلانے

والی، پاس بٹھا کر ایک ایک لفظ پڑھانے والی اور دوسری سطح معانی اور تصاویرِ ذہنی کی ہے۔ الفاظ ہولے سے قاری کی انگلی پکڑ کر اسے ایک اور ہی دنیا میں لے جاتے ہیں۔ ایک مختلف دنیا جہاں رنگ ہیں، روپ ہیں، بہروپ ہیں، عکس ہیں، آئینے ہیں، اشجار ہیں، طیور ہیں، بحور ہیں اور مناظر ہیں اور مناظر کے اندر کشش ہے۔ کشش بھی ایسی کہ پڑھنے والا انھی کا ہو کر رہ جائے۔

میر تقی میر اور ثروت حسین نے بہت سے زرخیز دماغوں اور نظام شمسی کا سا نسب رکھنے والے دلوں کو انتہائی متاثر کیا ہے۔ مبشر کے ہاں بھی اس حُسنِ تاثیر اور جمالِ استفادہ کا احساس ہوتا ہے مگر اس نے ان دیو پیکر سخن طرازوں کی لو سے جو دیا جلایا ہے وہ سراسر خود اسی کا ہے اور یہ معمولی بات نہیں ہے۔

مبشر سعیؔد کے اشعار سیدھے میرے دل میں اترے ہیں، ان میں سے چند ایک آپ بھی ملاحظہ کیجیے:

تو نہیں مانتا مٹی کا دھواں ہو جانا
تو ابھی رقص کروں، ہو کے دکھاؤں تجھ کو

دل بہ دل ہوتے ہوئے در بدری تک آئے
اپنی وحشت کے خد و خال سجانے کے لیے

تجھ کو معلوم ہے درویش نگاہوں والی!
ہم تری دید کو ملتان سے آئے ہوئے ہیں

باندھ کر ایک دیے کی لو میں
ہجر کی رات لیے پھرتے ہیں

اک عجب عالمِ حیرت میں چلے جاتے ہیں
تیری آواز میں آواز ملاتے ہوئے ہم

جسم اور روح کے آزار بڑھانے والی
میرے اطراف میں وحشت ہے ڈرانے والی
تو نے اِس رنگ کی قیمت کو بڑھایا ہوا ہے
اے سیہ رنگ کے ملبوس میں آنے والی!

جس کے کاندھوں پہ کبھی سر بھی نہیں تھا اپنا
اب وہی صاحبِ دستار نظر آتا ہے

چل رہا تھا تو سبھی لوگ مرے بازو تھے
گر پڑا ہوں تو کوئی ہاتھ بڑھانے کا نہیں

اُردو شاعری میں نئی آوازیں بہ کثرت شامل ہو رہی ہیں۔ یہ بجائے خود ایک بڑی اہم بات ہے۔ مبشر سعید کی خلاقیت سے بجا طور پر اُمید ہے کہ اگر وہ اسی اخلاص اور استقامت کے ساتھ سرگرمی سے محوِ سفر رہا تو اردو شاعری کے ستارہ بار اُفق پر اپنی الگ شناخت برقرار رکھنے میں ضرور سرفراز اور شادکام ٹھہرے گا۔

ڈاکٹر معین نظامی

پیش لفظ

صاحبو! ایک کہاوت ہے جس کا کام اسی کو ساجھے، سو شاعر کا کام ہے شعر کہے اچھا یا کم اچھا، اس کا ہنر شعر اگلنا ہی ہے. اب شعر کے معیاری یا غیر معیاری، جاوداں یا غیر جاوداں ہونے کی بحث مستقبل کی ہے کہ جس دیے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ شاعر کو صرف شاعر ہی رہنا چاہیے، اسے نقاد بننے یا اپنے مجموعے کی اشاعت پر اپنا مافی الضمیر بیاں کرنے کے بہانے کوئی نیا ادبی نظریہ پیش کرنے کی ناکام کوشش نہیں کرنی چاہیے، یہ کام نقادوں کا ہے اور اسی مہارت کے سبب ہی انھیں نقاد مانا جاتا ہے۔ اپنے پہلے مجموعۂ کلام کی اشاعت پر اپنے اور اپنی شاعری کے متعلّق چند گزارشات پیش خدمت ہیں:

اکثر اوقات لوگ بات، نجی گفت گوؤں یا انٹرویوز میں اپنی دل چسپیوں یا مشاغل کے بارے میں یہ کہتے ہوئے پائے جاتے ہیں کہ ہمیں ان امور کا بچپن سے ہی شوق تھا یا ہم اِبتدا سے ہی اس طرف مایل تھے۔ اب ان باتوں میں کہاں تک صداقت ہے اس کی تفتیش کے جھنجھٹ میں کون پڑے، البتہ ذاتی حوالے سے میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ مجھے بچپن تو کیا زندگی کے بیس سال گزانے کے باوجود شاعری تو کجا شعر و ادب سے بالکل کوئی مس بھی نہیں تھا۔ میں ان دنوں زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں زیرِ تعلیم تھا کہ کچھ دوستوں کے ساتھ یونی ورسٹی کی لٹریری سوسائٹی کے ایک پروگرام میں شریک ہونے کا موقع ملا اور پھر بار بار شرکت کے مواقع میسر آئے، بس وہیں سے کچا پکا شعر کہنا شروع کیا اور پھر لوگ ملتے چلے گئے، جن کے

ساتھ نشست و برخاست کے سبب پختگی اور مہارت کی طرف پیش قدمی کرتا رہا۔

میرے ابتدائی ادبی سفر میں فیصل آباد کے ادبی ماحول کا خاصا اثر ہے اور وہاں کے ادبا اور شعرا کا اس حوالے سے نہایت ممنون بھی ہوں کہ انھوں نے ہمیشہ میرے ساتھ شفقت اور محبّت کا برتاؤ رکھا۔ ایک نو آموز شاعر جتنا بھی کچھ اکتساب کر سکتا تھا میں نے بھی حسبِ توفیق اتنا کیا۔ بعدازاں بہ سلسلہ تعلیم فرانس منتقل ہو گیا۔ فرانس میں قیام کے دوران بھی بہ ذریعہ انٹرنیٹ بہت سے دوستوں سے رابطے رہے۔ فرانس سے واپسی کے بعد ایک سال اپنی جنم بھومی ملتان میں قیام پذیر رہا۔ ملتان میں قیام کے دوران اگرچہ کسی ادبی تنظیم سے میں باقاعدہ وابستہ تو نہیں رہا، البتہ یہاں کے بزرگ اور نوجوان شعرا سے راہ و رسم ضرور رہی۔ فکرِ معاش مجھے ایک بار پھر فیصل آباد لے آئی اور جاب کے ساتھ ساتھ شعر کہنا، ادبی حلقوں میں جانا، پاکستان بھر میں مختلف شہروں میں مشاعرے پڑھنا، شعرا سے تبادلہ خیالات، یہ سب سلسلے ایک بار پھر سے چل پڑے۔ اسی دورانیے میں قدیم و جدید اہم شعرا کے بالتفصیل مطالعے کا موقع بھی میسر آیا، جس سے یہ اندازہ ہوا کہ اردو غزل کہاں سے شروع ہو کر اب کہاں جا کر ٹھہری اور اس پورے منظرنامے مجھے کیا کرنا ہے، مجھے اپنی الگ پہچان بنانے اور اپنے لب و لہجے یا اسلوب کی دریافت کے لیے کن امور کو ملحوظ رکھنا ہو گا۔ خیر! میں نے ابتدا سے اب تک اپنا شعری اعمال نامہ: خواب گاہ میں ریت کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کرنے جا رہا ہوں۔ اب اس مقام پہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہنا چاہتا:

جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

آخر میں جناب محمد علوی، ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر معین نظامی، جناب عباس تابش اور اپنے لالا (حسن نواز شاہ) کی محبّتوں کا ممنون ہوں کہ انھوں نے میری تخلیقات کو اس قابل سمجھا کہ اس پر اظہارِ خیال کریں۔ ان کی شفقتوں سے بھرپور آرا پر صمیمِ قلب کے ساتھ ان کا احسان مند ہوں۔

مبشر سعید



گنبدِ سبز جہاں آج سجایا ہوا ہے
قطعہ یہ عرشِ معلّا سے ہی آیا ہوا ہے

ربِّ کعبہ نے اسی شہر کی قسمیں کھائیں
نور ہی نور جہاں آپؐ کا چھایا ہوا ہے

نعت گوئی کی محافل میں درودوں کی ندا
مدحِ سرکارؐ نے سرشار بنایا ہوا ہے

آپؐ کی آمدِ پر کیف کی خبریں سن کر
عالمِ خاک بہت وجد میں آیا ہوا ہے

وہ اگر سامنے آئیں تو قدم لوں ان کے
یہ سلیقہ مجھے اصحابؓ سے آیا ہوا ہے

نعت لکھنے کا ہنر سیکھنے والے نے سعیدؔ
آسماں اپنی ہتھیلی پہ اُٹھایا ہوا ہے





میں نے دیکھا ہے اس کی آنکھوں میں
کوئی رہتا ہے اس کی آنکھوں میں

سب کی آنکھوں سے حل نہیں ہوتا
کیا معمّا ہے اس کی آنکھوں میں؟

آنکھ ٹکتی نہیں ہے دیکھے سے
وہ اُجالا ہے اس کی آنکھوں میں

میں کنارے سے دیکھ سکتا ہوں
کوئی دریا ہے اس کی آنکھوں میں

لوگ مرتے ہیں اس کی آنکھوں پر
کچھ تو ایسا ہے اس کی آنکھوں میں

وہ جو منزل کی اور جاتا ہے
کوئی رستا ہے اس کی آنکھوں میں

حسن خوبانِ جملہ عالم کا
سمٹ آیا ہے اس کی آنکھوں میں

وہ سمندر مثال ہے ، تب ہی
چاند ڈوبا ہے اس کی آنکھوں میں

صبح ہونے کا خوش نما منظر
بھیگا بھیگا ہے اس کی آنکھوں میں

سب لگے ہیں تلاش کرنے میں
کیا خزانہ ہے اس کی آنکھوں میں؟

حُسن آدھا ہے مسکراہٹ میں
اور ، پورا ہے اس کی آنکھوں میں

رات ، زلفوں میں ڈوب جاتی ہے
دن نکلتا ہے اس کی آنکھوں میں

یہ مبشّر بھی دھیان جینے کا
بھول آیا ہے اس کی آنکھوں میں





شام کی زرد اداسی میں بٹھاؤں تجھ کو
زندگی! آ کبھی سینے سے لگاؤں تجھ کو

صاحبِ ہوش کو مدہوش بنانے کے لیے
آیتِ حُسن پڑھوں ، دیکھتا جاؤں تجھ کو

تو نہیں مانتا مٹی کا دھواں ہو جانا
تو ابھی رقص کروں ، ہو کے دکھاؤں تجھ کو؟

کر لیا ایک محبت پہ گزارا میں نے
چاہتا تھا کہ میں پورا بھی تو آؤں تجھ کو

اب مرا عشق دھمالوں سے کہیں آگے ہے
اب ضروری ہے کہ میں وجد میں لاؤں تجھ کو

اس نے اک بار محبّت میں کہا مجھ سے سعیدؔ
عین ممکن ہے کہ میں یاد نہ آؤں تجھ کو





زرد موسم کی اذیت بھی اُٹھانے کا نہیں
میں درختوں کی جگہ خود کو لگانے کا نہیں

اب ترے ساتھ تعلّق کی گزرگاہوں پر
وقت مشکل ہے، مگر ہاتھ چھڑانے کا نہیں

قریۂ سبز سے آتی ہوئی پر کیف ہوا!
طاق پر رکھا مرا دیپ بجھانے کا نہیں

چل رہا تھا تو سبھی لوگ مرے بازو تھے
گر پڑا ہوں تو کوئی ہاتھ بڑھانے کا نہیں

صبر کا غازہ مرے عشق کی زینت ٹھہرا
سو، میں آنکھوں سے کوئی اشک بہانے کا نہیں

مجھ کو یہ میر تقی میر بتاتے ہیں سعیدؔ
عشق کرنا ہے مگر جان سے جانے کا نہیں





دل نے روکا تھا مگر چھوڑ آیا
میں محبّت کا نگر چھوڑ آیا

خواب تو زادِ سفر ہوتے ہیں
اور میں زادِ سفر چھوڑ آیا

خود کو لے آیا میں اُس منظر سے
اور وہاں دیدہِ تر چھوڑ آیا

لو بچاتا تو یہ دن کب آتے
رات کی تیغ پہ سر چھوڑ آیا

ایک دہلیز پہ کچھ پھول دھرے
اک دریچے میں سحر چھوڑ آیا



جو رنگ ہائے رُخِ دوستاں سمجھتے تھے
وہ ہم نفس بھی مرا دکھ کہاں سمجھتے تھے

کُھلا کہ چادرِ شب میں بھی وسعتیں ہیں کئی
ذرا سی دھوپ کو ہم آسماں سمجھتے تھے

محبّتوں میں کنارے نہیں مِلا کرتے
''مگر یہ ڈوبنے والے کہاں سمجھتے تھے''

خزاں کے عہدِ اسیری سے پیش تر، طائر
چمن میں موسمِ گُل کی زباں سمجھتے تھے

انھیں بھی دہر کی فرزانگی نہ راس آئی
جو کارِ عشق میں سُود و زیاں سمجھتے تھے

کسی کا قُرب قیامت سے کم نہیں تھا سعیدؔ
فقط فراق کو ہم امتحاں سمجھتے تھے



شب کی دیوار گرا دی ہے شفق زادی نے
دھوپ، شہ کار بنا دی ہے شفق زادی نے

لمس کرنوں کا مرے خواب چُرا لیتا ہے
کیسی تصویر دکھا دی ہے شفق زادی نے؟

دل گُلِ تازہ کی خوشبو سے بھرا جاتا ہے
یوں سحر خیز ہوا دی ہے شفق زادی نے

کر دیے دان مجھے قُرب کے سندر لمحے
اور یوں مجھ کو بقا، دی ہے، شفق زادی نے

حالتِ ہجر میں اشکوں کی دھواں دار فضا
رخِ روشن سے سجا دی ہے شفق زادی نے

وہ ضیا بار تبسّم میں ملے گی مجھ کو
دل میں اُمید جگا دی ہے شفق زادی نے





پہنا ہے اس نے شوق سے جو پیرہن سفید
دِکھنے لگا ہے اور بھی اس کا بدن سفید

تعبیر تو ذرا مجھے اس کی بتائیے
دیکھا ہے میں نے نیند میں حیرت کا تن سفید

مرنے سے پہلے موت کی لذت کو جاننے
میں بھی خرید لایا ہوں اپنا کفن سفید

وہ جلوہ ہائے حسن دکھاتا رہا مجھے
کھلتا گیا لباس شکن در شکن سفید



یوں بھی چُھپتا ہے بھلا، وجد میں آیا ہوا رنگ
سب کو دِکھنے لگا احساس پہ چھایا ہوا رنگ

قیمتی شے کی طرح میں نے سنبھالا ہوا ہے
تیری پوشاک کے رنگوں سے چرایا ہوا رنگ

یعنی پھر میرے مقدر میں وہ ساعت آئی
پہنا ہے یار نے اب میرا بتایا ہوا رنگ

رقص کرتی ہوئی بل کھاتی ہوئی ڈالی پر
آنکھ نے دیکھا ہے شبنم میں نہایا ہوا رنگ

سُرمئی شام ڈھلی باغ میں خوشبو اُتری
یاد آیا تری قربت کا بھلایا ہوا رنگ

زرد لمحوں میں اگر لفظ خموشی اوڑھیں
حال کہتا ہے مری آنکھ میں آیا ہوا رنگ

اتنی توقیر جو میری ہے زمانے میں سعیدؔ
رنگ ہے مجھ پہ یہ مرشد کا چڑھایا ہوا رنگ





جذبوں کے تن پہ آئے ہوئے زخم چھیل کے
قصے سنا مجھے کسی شامِ طویل کے

صبر و رضا سے پُر ہے یہ تشنہ بدن مرا
نخرے اُٹھاؤں کس لیے دریا ذلیل کے

یعنی نہیں کُھلے گی یہ ذہنِ نفیس پر
کرتوت جانتا ہوں میں دنیا بخیل کے

کل میں نے چاند سے کہا آہستگی کے ساتھ
تم فرد لگ رہے ہو محبّت قبیل کے



خواب زدہ ویرانوں تک
پہنچی نیند ٹھکانوں تک

آوازوں کے دریا میں
غرق ہوئے ہیں شانوں تک

باغ ، اثاثہ ہے اپنا
وہ بھی زرد زمانوں تک

بنچ پہ پھیلی خاموشی
پہنچی پیڑ کے کانوں تک

عشق عبادت کرتے لوگ
جاگیں روز اذانوں تک

کرنیں ملنے آتی ہیں
گھر کے روشن دانوں تک

زرد اداسی چھائی ہے
کھیتوں سے کھلیانوں تک



سخت حالات میں جینے کا ہنر آتا ہے
نیند آئے تو مجھے خواب نظر آتا ہے

آنے والوں کو تو آنا ہے وہ آتے ہوں گے
جانے والا بھی کبھی لوٹ کے گھر آتا ہے؟

دل وہ درویش، کہ ہر ساعتِ حیرت کے حضور
جب بھی آتا ہے بِلا خوف و خطر آتا ہے

اب ذرا دھیان سے کر سامنا اس کا دنیا!
اب ترے سامنے اک خاک بسر آتا ہے

اس لیے چپ کے چمن زار میں رہتا ہے وجود
بات کرنے سے اداسی پہ اثر آتا ہے

کس کو آتا ہے یہاں اشک چھپانے کا ہنر
کام مشکل ہے، مبشّر کو ، مگر آتا ہے



ڈال کر عشق کی خیرات مرے کاسے میں
کر دیا خاک کے ذرّے کو ستارا اُس نے

زخم جب رِسنے لگے دل کی اُداسی کے سبب
مَل دیا درد کی دیوار پہ گارا اُس نے



ہاتھ میں ہات لیے پھرتے ہیں
ہم تجھے ساتھ لیے پھرتے ہیں

باندھ کر ایک دیے کی لَو میں
ہجر کی رات لیے پھرتے ہیں

مرنے والوں کو کہاں دفن کیا
ہم انھیں ساتھ لیے پھرتے ہیں





عجیب طور درختوں نے شب گزاری ہے
کہ شاخ شاخ قیامت کی سوگواری ہے

یہ کیسا عشق ہے جو آنکھ تک نہیں آتا
یہ کیسی آگ ہے جو روشنی سے عاری ہے

ہمارے دل کو ابد سے کوئی علاقہ نہیں
ہمارے دل کو ازل سے لگن تمھاری ہے

وہ جس کے سامنے کاسہ بدست ہے دنیا
سعیدؔ بھی اسی دہلیز کا بھکاری ہے



عالمِ وجد سے اظہار میں آتا ہوا میں
یعنی، خود خواب ہوا، خواب سناتا ہوا میں

زندگی ہجر ہے اور ہجر بھی ایسا کہ نہ پُوچھ
سانس تک ہار چکا، وصل کماتا ہوا میں

چاندنی رات میں دریا سی رواں یاد کے ساتھ
اپنی مرضی سے چلا، جھومتا گاتا ہوا میں

یار! دیکھو تو کبھی موسمِ ہجراں کی طرف
خاک ہوتا ہوں یہاں، دشت سجاتا ہوا، میں

شاخِ امکاں سے تری یاد کی مہکار چنوں
ایک بھنورا سا ترے باغ کو جاتا ہوا میں

حلقۂ شعر سے گزروں گا محبّت میں سعیدؔ
اپنے جذبات کو الفاظ میں لاتا ہوا میں





بن جاتا ہے وہ زیست کا معیار، پری زاد!
لگتا ہے جسے عشق کا آزار، پری زاد!

منظر نظر آئے مجھے اک جیسا شفق رو
اِس آر، پری زاد! ہے، اُس پار، پری زاد!

اعصاب پہ چھایا ہوا تجھ یاد کا میلہ
کرنے لگا مجھ دشت کو گل زار، پری زاد!

ہے اتنا حسیں باغ میں تجھ دید کا منظر
دیکھا کِیا میں تجھ کو لگاتار، پری زاد!

مجھ دل کو کہاں بھاتا ہے، اب تیرے سوا اور
کیا دیکھوں غزالانِ طرح دار؟، پری زاد!



میں تو بیٹھا تھا ہر اک شے سے کنارا کر کے
وقت نے چھوڑ دیا مجھ کو تمھارا کر کے

بات دریا بھی کبھی رک کے کیا کرتا تھا
اب تو ہر موج گزرتی ہے اشارا کر کے

اِک دیا اور جلایا ہے سحر ہونے تک
شبِ ہجراں کا ترے نام ستارا کر کے

جب سے جاگی ہے ترے لمس کی خواہش دل میں
رہنا پڑتا ہے مجھے خود سے کنارا کر کے

دشت! چھانے گا تری خاک محبّت سے سعیدؔ
عشق! دیکھے گا تجھے سارے کا سارا کر کے



جینا اب اور نہ دشوار بناؤ ، جاؤ
زندگی! درد کا سامان اُٹھاؤ ، جاؤ

ہم محبّت بھی عبادت کی طرح کرتے ہیں
واعظو! ہم کو عبادت نہ سکھاؤ ، جاؤ

ہے ہمیں راس یہ گم نام جزیرے کی فضا
گر کمانا ہے تمھیں نام ، کماؤ ، جاؤ

ہم نے ہموار بنا ڈالا ہے اس کا رستہ
وادیٔ عشق میں آرام سے آؤ جاؤ

تم کو اک ہجر نے بے حال سا کر رکھا ہے
جاؤ ، ہم کو یہ کہانی نہ سناؤ، جاؤ

مت ڈرو دشت کے پرخوف علاقے میں سعیدؔ
آ گئے ہو تو یہاں خاک اڑاؤ، جاؤ



دن میں بہتی رہی ہے دریا بیچ
شب کو کپڑے بدل رہی ہے ہوا

زرد پیڑوں کی اوٹ میں چُھپ کر
ایسا لگتا ہے رو رہی ہے ہوا



پہلے وہ اچانک نظر آیا، اسے دیکھا
جب دل نے کیا اور تقاضا، اسے دیکھا

منظر وہ مری آنکھ سے جاتا ہی نہیں ہے
اک روز دریچے سے میں جھانکا، اسے دیکھا

دریا سا سمندر میں اترنے کو تھا بے تاب
اترا اسے دیکھا، جو وہ ڈوبا، اسے دیکھا

اک شام وہ کچھ ایسا کھلا مجھ میں سمٹ کر
میں جیسا سمجھتا تھا سو ویسا، اسے دیکھا

خواہش تھی چمن جیسا بنائے وہ بدن کو
دریا تھا مگر پیاس کا صحرا، اسے دیکھا

چھایا ہے مرے ذہن پہ اک شخص مجھی سا
لگتا ہے کہ جس نے مجھے دیکھا، اسے دیکھا





رقص کرتے ہوئے سب ہوش بھلا دیتا ہوں
دیر تک وجد میں رہتا ہے سراپا میرا

ایک شب زاد نے بسرام کیا تھا مجھ میں
تب سے دن، رات سا رہتا ہے ہمیشہ میرا

آئنہ عکس مرا دل سے لگائے رکھے
دھوپ رنگین کیے دیتی ہے سایا میرا





انکار کی لذت سے نہ اقرارِ جنوں سے
یہ ہجر کُھلا مجھ پہ کسی اور فسوں سے

عجلت میں نہیں ہوگی تلاوت ترے رخ کی
آ بیٹھ مرے پاس ذرا دیر سکوں سے

دیوار کا سایہ تو مجھے مل نہیں پایا
بیٹھا ہوں تری یاد میں اب لگ کے ستوں سے





جو لوگ تھے ہمارے دل و جاں کہاں گئے
جن کے بغیر زیست ہے ویراں کہاں گئے

جن پر فضائے صبح کے لمحے نثار تھے
وہ پیڑ وہ پرندوں کے ایواں کہاں گئے

اک حیرتِ جمال میں گُم صم کھڑا تھا چاند
دریا پہ لوگ کر کے چراغاں کہاں گئے

دل خواب میں بھی وجد کی حالت میں تھا سعیدؔ
ہم کیا کہیں کہ نیند میں رقصاں کہاں گئے



وصل کی روشنی آنکھوں میں بسانے کے لیے
تم بھی سو جاؤ مرے خواب میں آنے کے لیے

مجھ کو احساس کی چوکھٹ پہ کھڑے رہنا ہے
اپنے حصے کے سبھی رنج اٹھانے کے لیے

یہ درختوں کی قطاریں یہ ستاروں کا ہجوم
مجھ کو رکنا ہے یہاں چاند بنانے کے لیے

دل بہ دل ہوتے ہوئے در بہ دری تک آئے
اپنی وحشت کے خدوخال سجانے کے لیے

یہ مرا دل ہے عزا خانۂ وحشت، جس میں
لوگ آتے ہیں فقط رنج منانے کے لیے

تم اگر غور سے دیکھو تو مری آنکھوں میں
خواب کے رنگ ہیں تعبیر بنانے کے لیے

مجھ کو پھر اپنی طرف لوٹ کے آنا ہے سعیدؔ
دل لگانے کے لیے، خواب سنانے کے لیے



کب مری حلقۂ وحشت سے رہائی ہوئی ہے
دل نے اک اور بھی زنجیر بنائی ہوئی ہے

عشق میں جراتِ تفریق نہیں قیس کو بھی
تو نے کیوں دشت میں دیوار اُٹھائی ہوئی ہے؟

تیری صورت جو میں دیکھوں تو گماں ہوتا ہے
تو کوئی نظم ہے جو وجد میں آئی ہوئی ہے

اِک پری زاد کے یادوں میں چلے آنے سے
زندگی وصل کی بارش میں نہائی ہوئی ہے

سامنے بیٹھ کے دیکھا تھا اُسے وصل کی رات
وہی رات آج بھی اعصاب پہ چھائی ہوئی ہے

آ کے دیکھو مری تنہائی کے صحرا میں سعیدؔ
ایک محفل ہے جو اب رنگ پہ آئی ہوئی ہے



گھر کے آنگن میں لگا پیڑ کٹا ہے جب سے
ہم تری بات پرندوں کو سنانے سے گئے

اپنی منزل کی طرف، اپنے نصیبے کی طرف
ہم ہی تاخیر سے پہنچے، سو ٹھکانے سے گئے



یعنی ثروت کی پیروی کر لوں
جی میں آتا ہے خودکشی کر لوں

موت کی بارگاہ میں جاؤں
اپنے ہونے کو دایمی کر لوں

جا کے بیٹھوں میں دشت کے اندر
اور دنیا کو اجنبی کر لوں

زیبِ تن کر لوں خامشی کا لباس
تو کہے تو ابھی ابھی کر لوں

حضرتِ قیس جو اجازت دیں
میں دوانوں کی رہبری کر لوں

آپ کی بے مثال آنکھوں پر
گر اجازت ہو شاعری کر لوں

کوئی میرا بھی ہو زمانے میں
یعنی پیڑوں سے دوستی کر لوں

اُس پری زاد نے جب پاس بٹھایا تو سعیدؔ
مجھ کو محسوس ہوا اپنا مکمّل ہوتا



دشتِ ہجراں سے محبّت کو نبھاتے ہوئے ہم
خاک ہوتے ہیں میاں! خاک اڑاتے ہوئے ہم

اِک عجب عالمِ حیرت میں چلے جاتے ہیں
تیری آواز میں آواز ملاتے ہوئے ہم

صورتِ حال کو غمگین بنانے والے!
کیسے لگتے ہیں تجھے رنج مناتے ہوئے ہم؟

صاحبِ کشف پرندوں کی کہانی کہہ کر
سو گئے آپ درختوں کو سلاتے ہوئے ہم

یاد ہے تجھ کو مری روح بساتے ہوئے شخص!
ہنستے رہتے تھے سدا باغ کو جاتے ہوئے ہم

موسمِ سبز میں بے حال ہوئے جاتے ہیں
اپنی آنکھوں سے ترے اشک بہاتے ہوئے ہم





موسم ہے خوش گوار، مرے ساتھ ساتھ چل
اے رشکِ نو بہار! ، مرے ساتھ ساتھ چل

دنیا بڑی فضول ہے، بالکل فضول ہے
دنیا کو چھوڑ یار!، مرے ساتھ ساتھ چل

چلنا بھلے محال ہو دشتِ گماں میں
پھر بھی یقیں شعار، مرے ساتھ ساتھ چل

اُلفت ترا وجود ہے، اُلفت مرا وجود
کر اس کا اعتبار، مرے ساتھ ساتھ چل

تنہا سفر کی ناؤ میں کتنا اداس ہوں
آ تو بھی ہو سوار، مرے ساتھ ساتھ چل

جیون کی رہ گزر پہ تو آ مثلِ ہم سفر
کر ختم انتظار، مرے ساتھ ساتھ چل

مجھ کو دوام بخش دے اپنے وصال سے
یعنی تو بار بار، مرے ساتھ ساتھ چل





بے خبر ہوتے ہوئے ساری خبر جانتے ہیں
کیسے کرنا ہے یہ خوابوں کا سفر، جانتے ہیں

اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے شاید
ہم درختوں کو پرندوں کا نگر جانتے ہیں

زیست کرنا تو کوئی کام نہیں ہے صاحب!
کرنے والے تو یہاں عشق بھی کر جانتے ہیں

یہی اقرار کی صورت ہے گواہی کی بھی
ہم نہیں جانتے لوگوں کو، مگر جانتے ہیں

اس لیے خاک اڑانا ہے مقدر اپنا
ہم جنوں زاد تو صحرا کو ہی گھر جانتے ہیں



اُجالے سے مرا شکوہ نہیں کیا؟
اندھیرا ہے ، مجھے دکھتا نہیں کیا؟

انھیں مجھ سے عداوت ہے، نہیں تو
مگر ایسا ہے، پر ایسا نہیں کیا؟

میں اپنی ذات کے صحرا سے گزرا
یہاں سے آگے بھی دریا نہیں کیا؟

کبھی آواز کی خوشبو سُنی ہے؟
کبھی دیوار کو دیکھا نہیں کیا؟

یہاں سے دھوپ تو روٹھی ہوئی ہے
یہاں پہ ابر بھی رکتا نہیں کیا؟

میں صحرا ہوں، یہاں کا ہر مسافر
پرانے خواب کے جیسا نہیں کیا؟

یہ کیا دیوانِ غالب کے حوالے؟
ہمارا شعر کچھ تازہ نہیں کیا؟



اے مِری وحشتوں کے باعث شخص
تو مجھے ہر طرح گوارا ہے



جسم اور روح کے آزار بڑھانے والی
میرے اطراف میں وحشت ہے ڈرانے والی

روز دیتی ہے وہ جینے کی دعائیں مجھ کو
وہ جو اک دوست ہے، وہ دوست، پرانے والی

اپنی توقیر بڑھانی ہے، بڑھا لے، لیکن
کوئی تہمت تو لگا، مجھ پہ لگانے والی

تو نے اس رنگ کی قیمت کو بڑھایا ہوا ہے
اے سیہ رنگ کے ملبوس میں آنے والی!

اپنے احوال کو اشعار میں ڈھالا میں نے
بات چھپتی ہی نہیں مجھ سے چھپانے والی

جیتے رہنے کا ہنر آپ سکھاتی ہے سعیدؔ!
ہم میں حائل ہے جو دیوار زمانے والی



روز اُلجھی دیکھوں مَیں
اپنی رُوح گناہوں سے

زندہ کیسے آتے ہیں
لوگ ، جنازہ گاہوں سے



آ، دیکھ، مری آنکھوں میں اک بار، مرے یار!
روشن ہیں کسی ہجر کے آثار، مرے یار!

لے جا تو رفاقت کے یہ پل ، وصل کا جنگل
رہنے دے یہاں ہجر کے آزار، مرے یار!

مل جائے جو مجھ ایسا کوئی مجھ کو، بہت ہے
جز اس کے نہیں کچھ مجھے درکار، مرے یار!

اے قیس! یہ کیا نجد کی وحشت کا اثر ہے؟
اب خواب میں آتا ہے چمن زار، مرے یار!

لمحاتِ جدائی ، یہ دُعائیں ، یہ اداسی
کیوں ہاتھ چھڑانے کو ہے تیار؟ مرے یار!



شاعری میں ڈھال کر
خود کو لازوال کر

وسوسے دکھاؤں کیا؟
ذہن سے نکال کر

یار! احتیاط سے
مجھ کو پائمال کر

آنکھ میں جو خواب ہیں
ان کی دیکھ بھال کر

مجھ کو ٹوٹ جانے دے
میرا مت خیال کر

سانحے گزر گئے
سانحے میں ڈھال کر

آستیں کے سانپ کی
خوب دیکھ بھال کر

جا کے شاہ شمسؒ پہ
بیٹھ نہ ، دھمال کر





حقیقت ہے مگر ایسا نہیں تھا
تمھارے شہر میں دریا نہیں تھا

درختوں سے یہ پتوں کا بچھڑنا
کسی بھی طور سے اچھا نہیں تھا

سحر کے وقت ہی کھلتی ہوئی نیند!
سنا، وہ خواب، جو دیکھا نہیں تھا

پرانے جسم کا بیکار چہرہ
سفر کی دھول سے میلا نہیں تھا

دیے سے دوستی رکھی ، بہر طور
ہوا کا ساتھ بھی چھوڑا نہیں تھا

مری آنکھوں میں اشکوں کا سمندر
کوئی بھی دیکھنے والا نہیں تھا

اداسی کے فرشتے نے مبشّر
اداسی میں مجھے دیکھا نہیں تھا



بے بہا سُرمئی اداسی میں
کاٹ دی رات بھی اداسی میں

چاند ، سہما ہوا سا لگتا ہے
رات پر پھیلتی اداسی میں

میں پرندوں سے ہم کلام ہوا
صبح کی شبنمی اداسی میں

اپنا اپنا نصیب ہے، یعنی
کٹ گئی زندگی اداسی میں

دل کی پوچھو تو بڑھنے لگتی ہے
روح کی تازگی اداسی میں

اس کی سوچوں پہ نیل پڑ جاتے
وہ اگر سوچتی اداسی میں

جو اٹھائی تھی ضبط کی دیوار
رات وہ گر پڑی اداسی میں





اپنے رنگوں میں ترا عکس چھپائے ہوئے ہیں
خواب ، نیندوں کے دریچوں کو سجائے ہوئے ہیں

تجھ کو معلوم ہے درویش نگاہوں والی!
ہم تری دید کو ملتان سے آئے ہوئے ہیں

ہم وفا کیش، زمانے کے ستائے ہوئے لوگ!
زندگی! دیکھ ترا ساتھ نبھائے ہوئے ہیں

وصل کی رات ہے، نیندوں کے جھروکوں سے اُدھر
دو ستارے کسی حیرت میں نہائے ہوئے ہیں

کشورِ عشق! ترے دشت کے سندر رستے
آنکھ کو بھائے ہوئے، روح پہ چھائے ہوئے ہیں



سچے سُچے جذبوں سے
پیار دکھے ہے آنکھوں سے

نہر کنارا بھاتا ہے
شہر کے باقی رستوں سے

عشق ہوا ہے پیڑوں کو
بنچ پہ بیٹھے لوگوں سے

جب بھی اس سے ملتا ہوں
بھر جاتا ہوں شعروں سے

تیرے نام کا ورد کیا
وحشت نکلی کمروں سے

خواب اُٹھانے جاتا ہوں
نیند کی ساری سڑکوں سے

اب دریا پہ چلتے ہیں
ہاتھ ملانے لہروں سے

جسم کی رنگت بڑھتی ہے
تیری روح کے کپڑوں سے

مجھ کو بھی ہے پیار سعیدؔ
زرد ، گلابی پھولوں سے





جب کہ ہوتا تھا اک خلا مجھ میں
عشق چپکے سے آ بسا مجھ میں

اے حقارت سے دیکھنے والے!
کیا کوئی نقص رہ گیا مجھ میں؟

ہر کسی کو دکھائی دیتا ہے
ایک موسم رکا ہوا مجھ میں

خود کو دیکھوں تو پھوٹ پڑتا ہے
روتے روتے ہی قہقہہ مجھ میں

خود سے باہر قیام کرنے کا
سر اُٹھاتا ہے حادثہ مجھ میں

آن لگتا ہے خواہشوں کا ہجوم
دن نکلتے ہی جا بجا مجھ میں

لوگ منزل کی اور بڑھتے ہیں
جب بھی کھلتا ہے راستا مجھ میں





ہجر کی رت کا طرف دار بھی ہو سکتا ہے
دل، خسارے سے ثمر بار بھی ہو سکتا ہے

کیا ضروری ہے فقط دشت میں وحشت ہو میاں!
یہ تماشا سرِ بازار بھی ہو سکتا ہے

دکھ ، پرندوں کی طرح شور مچا سکتے ہیں
ہجر ، پیڑوں سے نمودار بھی ہو سکتا ہے

میری ہر رات کو فردوس بنانے والی!
دل ، ترے خواب سے بیدار بھی ہو سکتا ہے



تیری آنکھوں میں رت جگا تو نہیں؟
پوچھ خود سے تو بے وفا تو نہیں؟

عرش سے فرش تک اداسی ہے
عرش تا فرش کربلا تو نہیں؟

جتنا سمجھا ہے مجھ کو اپنوں نے
میں کوئی اس قدر برا تو نہیں؟

سانس جاری ہے زور و شور کے ساتھ
مجھ کو جینے کی بد دعا تو نہیں؟

آئنہ دیکھ کے یہ پوچھتا ہوں
میں کہیں آپ سے ملا تو نہیں؟

یہ جو میں دربدر بھٹکتا ہوں
میں کہیں خود کو ڈھونڈتا تو نہیں؟

تجھ سے تو بے تکلّفی ہے مری
تو مرا دوست ہے ، خدا تو نہیں





تیری یادوں کو ہم اشکوں میں بھگوئے ہوئے ہیں
غور سے سُن تو سہی قہقہے روئے ہوئے ہیں

وادیٔ خواب میں تتلی کو پکڑنے والے!
جاگتے ہیں، ترے پہلو میں نہ سوئے ہوئے ہیں

کیوں محبّت کو نہ ہم عشق میں تبدیل کریں
نرم کونپل تھے، گُلِ تر سے نروئے ہوئے ہیں

پیش منظر کو حسیں کرتے ثمربار درخت
کون ہاتھوں کی مہارت سے یہ بوئے ہوئے ہیں؟

لفظ لکھتے ہیں جو ہم حال میں فردا کے لیے
کتنے ازرفتہ زمانوں سے یہ ڈھوئے ہوئے ہیں

ساعتِ ہجر بنی وصل کا یوں لمحہ سعیؔد
غمِ رفتہ کو روانی میں پروئے ہوئے ہیں



ہم کو ہوتا ہے میسر جو نظارا اپنا
تیرہ بختی میں چمکتا ہے ستارا اپنا

زرد پتوں نے ہواؤں کی زبانی کل شب
خود سنایا ہے ہمیں حال بھی سارا اپنا

دھوپ نے پنکھ بکھیرے تو پہاڑوں نے سعیؔد
برف کی اوٹ سے بخشا ہے نظارا اپنا



مجھ سے یہ بات نہیں تم نے چھپائی ، پانی!
کیسی لگتی ہے مری اشک فشانی ، پانی!

چودہ صدیوں سے ترا ذکر چلا آتا ہے
وقت نے بخشی سدا تجھ کو جوانی ، پانی!

خیمۂ صبر میں پہنچا نہ بوقتِ مشکل
پانی تب سے ہی ہوا پھرتا ہے ، پانی پانی

بیٹھ جاتا ہوں کنارے سے لگا کر تکیہ
رات بھر مجھ کو سناتا ہے کہانی ، پانی

صبر کرنا ہے تو کرتے ہی چلے جانا ہے
پاس رہ کر بھی نہیں پیاس بجھانی ، پانی!

سانس کی دھوپ میں ہر وقت ہی جلتے ہوئے ہونٹ
خشک ہونے کے یہی صاف معانی ، پانی!

دشت کے سخت سفر میں تو ہمیشہ ہی سعیدؔ
ختم کرتا ہے طبیعت کی گرانی ، پانی!

میں اگر پھول کی پتّی پہ ترا نام لکھوں
تتلیاں اُڑ کے ترے نام پہ آنے لگ جائیں



ہجر والوں کا طرفدار نظر آتا ہے
آئنہ ، مجھ کو سمجھ دار نظر آتا ہے

اپنی تعبیر کی محرومی پہ روتا ہوا خواب!
میری آنکھوں کو عزادار نظر آتا ہے

جس کے کاندھوں پہ کبھی سر بھی نہیں تھا اپنا
اب وہی صاحبِ دستار نظر آتا ہے





جسم کو جسم سے ملاتا ہوں
روح کی تازگی بڑھاتا ہوں

رات جب شور کرنے لگتی ہے
میں اسے خامشی سناتا ہوں

خوب روتا ہوں بے ثباتی پر
اپنے ہونے پہ مسکراتا ہوں

حالِ وحشت سنا سنا کے اسے
دشت کی حیرتیں بڑھاتا ہوں

تا کہ اندر کی وحشتیں نکلیں
اس لیے قہقہے لگاتا ہوں

جاگ کر پتھروں کے پہلو میں
رات بھر آئنے بناتا ہوں

چاند جب بادلوں میں چھپتا ہے
رات کو راستہ دکھاتا ہوں





باب جب مجھ پہ کھلا قریۂ ویرانی کا
حال پھر دیکھ لیا دشت میں حیرانی کا

مجھ کو اشکوں سے محبّت تو نہیں تھی لیکن
دل نے آزار چنا ہجر کی سلطانی کا

عشق وہ کارِ مسلسل ہے کہ جتنا بھی کرو
کوئی نقصان نہیں ہوتا فراوانی کا

حضرتِ قیس کی سنت پہ عمل کرتے ہوئے
فرض کرتا ہوں ادا چاک گریبانی کا

دل کے احوال محبّت کو سنانے کے لیے
بخت نے وقت دیا شام کی ویرانی کا

اپنی تصویر سے اتنا وہ کُھلا ہے مجھ پر
شائبہ تک نہیں ہوتا کسی عریانی کا

اب مرے ہونٹ ستاروں کی طرح روشن ہیں
ایک بوسہ جو لیا تھا کسی پیشانی کا





نیندوں کی خواب گاہ میں کچھ خواب دھر گئی
کل، رات مجھ غریب پہ احسان کر گئی

ساحل کی نرم ریت پہ سویا ہوا تھا میں
اِک لہر مجھ کو خواب میں چھو کر گزر گئی

منظر یہ دل خراش تھا آنکھوں کے واسطے
وحشت طلوعِ شام سے تا بہ سحر گئی

مجنوں کی بارگاہ میں جانا نہیں پڑا
صحرا کی حاضری سے ہی حیرت سنور گئی



اپنی حیرت میں لا رہا ہے مجھے
دشت ، خود سا بنا رہا ہے مجھے

میں اداسی کا گیت ہوں ، لیکن
دل سہولت سے گا رہا ہے مجھے

ایک دیوار مجھ سے پوچھتی ہے
کون اندر سے ڈھا رہا ہے مجھے؟

کون اپنے سنہری ہاتھوں سے
میرے جیسا بنا رہا ہے مجھے

ایک کمرا ، کہ خواب جیسا ہے
دھیان جس کا جگا رہا ہے مجھے

ایک کشتی اُداس بیٹھی ہے
ایک دریا بلا رہا ہے مجھے

دشت کی پیاس یاد آتی ہے
رنج دریا کا کھا رہا ہے مجھے





دشت ہجراں کی مسافت کو اٹھائے، مجھ میں
اُتر آئے ہیں تری یاد کے سائے مجھ میں

اشک بہتے ہیں لگاتار مری آنکھوں سے
صبر اب اپنی کرامات دکھائے مجھ میں

جس نے بخشی ہے مجھے زرد شجر سی قسمت
وہ خزاؤں کی محبّت بھی بڑھائے مجھ میں

یہ تری یاد کا، آواز کا، احساس کا لمس
وصلِ ضو ریز کے جذبات جگائے مجھ میں

خاک ہوتے ہوئے لمحوں کا فسوں جاری ہے
ایسے عالم میں کہاں زیست سمائے مجھ میں

جس کو معلوم نہ ہو دل کا اُجڑنا کیا ہے
چند لمحوں کے لیے وقت بتائے مجھ میں





یعنی جیون کو بھی آزار بنائے گریہ
آنکھ سے اشک نہیں خون بہائے گریہ

دم بہ دم نیر بہاتے ہوئے رقصاں بنیں
ہجر والوں کو اگر وجد میں لائے گریہ

چھوڑ جاتے ہیں جہاں یار اکیلا کر کے
ایسی تنہائی میں بس ساتھ نبھائے گریہ

جانے کس موڑ پہ لے آیا ہے جیون مجھ کو
چار اطراف سے آتی ہے صدائے گریہ

دل کے احوال کو اظہار کی صورت دینے
میری آنکھوں میں ہمیشہ اُتر آئے گریہ

عالمِ غیب سے ملتی ہے ہمیشہ ہی سعیدؔ
دشتِ ہجراں کے مکینوں کو دعائے گریہ





دوانہ وار ، مسلسل کلام کرتے ہیں
حضورِ یار ، مکمّل کلام کرتے ہیں

شجر اداس ہیں لیکن بڑے خشوع کے ساتھ
سکوت اوڑھ کے ہر پل کلام کرتے ہیں

کئی مقام تو ایسے نظر سے گزرے ہیں
کہ حبس بڑھتا ہے، بادل کلام کرتے ہیں

تمھیں یہ کس نے کہا ہے کہ مصلحت میں رہو
جہاں پہ جبر ہو، پاگل! کلام کرتے ہیں

لہو کے رنگ میں رنگین کر کے جسموں کو
عدو کے سامنے مقتل کلام کرتے ہیں

اگر جلال میں آئیں تو دنیا والوں سے
فقیر ، آنکھ سے اوجھل کلام کرتے ہیں

مجھے سعیدؔ ، اداسی نے خامشی سے کہا
سفر طویل ہے تو چل ، کلام کرتے ہیں





آنکھ کھولوں گا تو یادوں کے خزانے ہوں گے
نئے کپڑوں میں وہی لوگ پرانے ہوں گے

پیڑ نے بور نہیں عشق اُٹھایا ہے میاں!
اب درختوں سے بھی منسوب فسانے ہوں گے

میرا دشمن مرے اندر ہی چھپا بیٹھا ہے
مجھ کو خود اپنی طرف تیر چلانے ہوں گے

مجلسِ ہجر کی توقیر بڑھانے کے لیے
آنکھ سے اشک نہیں خواب بہانے ہوں گے

بس کہانی میں یہاں تک ہی سفر تھا اپنا
اس سے آگے تو ہمیں ہاتھ چھڑانے ہوں گے

رات نے نیند کا بازار لگایا ہے سعیدؔ!
اب مجھے آنکھ میں کچھ خواب سجانے ہوں گے





کہانی کی اداسی میں لکھا ہے
مرا مرنا ضروری واقعہ ہے

بڑی حیرت، بڑی وحشت میں، کل شب
کسی دیوار کا رونا سنا ہے

فضائے حبس کا اعجاز دیکھو
ہوا کا جسم بھی سوکھا ہوا ہے

مرے دشمن کو بتلاؤ ، یہاں سے
پلٹ جانا ہی بہتر فیصلہ ہے

خزاں کا خوف سینے سے لگا کر
شجر ، دیوار سے لپٹا ہوا ہے

کوئی تازہ ہوا تازہ فضا ہو
مرا سینہ گھٹن سے بھر گیا ہے





جو ترے قرب سے چرانی ہے
نظم وہ شام کو سنانی ہے

نیند کے سُرمئی جزیرے پر
خواب کی جھونپڑی لگانی ہے

جسم نے رقص کرتے رہنا ہے
آنکھ نے 'ہیر' گنگنانی ہے

دن ، تو دریا میں پھینک آیا ہوں
رات ، یاروں میں بیت جانی ہے

جو سنائی ہے وجد میں آ کر
عشق کی سانولی کہانی ہے

میں نے ہجراں کی طاق راتوں کو
وصل کی بانسری سنانی ہے

ایسا لگتا ہے زندہ رہنے میں
رایگانی ہی رایگانی ہے





نیند کی شان بڑھائے تو مزہ آ جائے
تو مرے خواب میں آئے تو مزہ آ جائے

دشت میں شام ڈھلے ، خیمۂ حشت کے تلے
ریت، حیرت کو سلائے تو مزہ آ جائے

دل کی دیوار پہ اس شخص کی آواز سے میں
دیکھوں اظہار کے سائے تو مزہ آ جائے

شام کی نبض رکی، رات نے آنکھیں کھولیں
نیند اب تجھ سے ملائے تو مزہ آ جائے

آج بادل ہیں ،ستارے بھی چھپے بیٹھے ہیں
رات اب 'ہیر' سنائے تو مزہ آ جائے

میرے پہلو میں ہو درویش نگاہوں والی
وقت وہ پل بھی دکھائے تو مزہ آ جائے

جو پرندہ ترے آنے کی خبر دیتا ہے
وہ مجھے ڈھونڈ نہ پائے تو مزہ آ جائے

شام کے ساتھ برستی ہوئی حیرت میں سعیدؔ
وہ مرے ساتھ نہائے تو مزہ آ جائے





اپنے دل سے تو عداوت کو بھلانا ، دنیا!
یہ زمانہ ہے محبّت کا زمانہ ، دنیا!

صرف محنت کو رگ و پے میں سمایا ہوا ہے
تاکہ ضوریز بنے میرا ٹھکانا ، دنیا!

جس کو دیکھو ، وہی آزار سناتا ہے ترے
کر دے آساں ، مرا دنیا میں ٹھکانا ، دنیا!

تیرے اجمال کے حلقے میں مزا لینے کو
وقت باقی ہے مرا کتنا ، بتانا ، دنیا!

ہاتھ جوڑے ہوئے بس ایک گزارش ہے مری
اپنے شر سے تو مجھے آپ بچانا ، دنیا!

جتنی سانسیں ہوں میسر، وہ سکوں والی ہوں
کبھی مشکل نہ بنے میرا ٹھکانا ، دنیا!

بِھیڑ کا شور اگر جان کو آتا ہے سعیؔد
اس کا مطلب ہے فقط راس نہ آنا دنیا





غم کے موسم میں اذیت نے سند جاری کری
اشک نے آنکھ کی دنیا سے نموداری کری

جیسے حالات ہیں ویسا ہی نظر آتا ہوں
خود پہ مانگی ہوئی وحشت تو نہیں طاری کری

شعر کہنا مجھے آساں تو نہیں تھا، لیکن
موسمِ ہجر میں اشکوں نے اداکاری کری

میں نے حیرت کی نگاہوں میں بھی حیرت دیکھی
جب ہواؤں نے چراغوں کی طرفداری کری

غیر ممکن تھا مگر نام کمانے کے لیے
دل کے بازار سے زخموں کی خریداری کری

وہ جہاں پر ہے نہیں چین میسر اس کو
بس اسی بات نے دل میں بڑی بیزاری کری

عشق کے در پہ جبیں اس نے جھکائی تو سعیدؔ
پھر زمانے نے مبشّر سے بھی دل داری کری





ساحلوں کو کہانی سناتا رہا ، دل جلاتا رہا
اشک آنکھوں سے اپنی بہاتا رہا ، دل جلاتا رہا

دوپہر کی چمک یاد لاتی رہی ، مسکراتی رہی
کوئی ہجراں کے نغموں کو گاتا رہا ، دل جلاتا رہا

رات جب آ گئی ، آسماں کی فضا روشنی سے اٹی
میں اکیلا اداسی بِتاتا رہا ، دل جلاتا رہا

ریشمی زین پر، شب گذرتی رہی، دل کے قالین پر
وقت جسموں کی قربت سجاتا رہا، دل جلاتا رہا



نیند کے باغ سے اشکوں کو اُٹھانے والے!
مر گئے خواب ، مری آنکھ میں آنے والے

مستقل ہجر میں رہتا ہوں تو حیرت کیسی
لگ ہی جاتے ہیں کبھی، روگ نہ جانے والے!

میں بھی چپ چاپ اداسی میں پڑا رہتا ہوں
اے مری یاد میں اشکوں کو بہانے والے!

تو تو دنیا کو بدلنے کے لیے نکلا تھا
لگ گئے روگ تجھے کیسے زمانے والے!

صاف کہتی ہے مجھے دشت کی تاریخ سعیدؔ!
خاک ہوتے ہیں یہاں خاک اڑانے والے!



اس سے پہلے کہ دھواں آنکھ میں آنے لگ جائے
یہ ضروری ہے دیا ، لو کو بڑھانے لگ جائے

کتنا اچھا ہو کہ لہروں کو جلانے کے لیے
چاند ، پانی پہ ترا عکس بنانے لگ جائے

میرے مولا! تو مجھے ایسی اذیت سے بچا
جب خریدار ، مرے دام گھٹانے لگ جائے

میں اگر وحشتِ ہجراں سے مودّت کر لوں
پھر تو صحرا بھی مری خاک اُڑانے لگ جائے

مالکا! میرے مقدر میں بھی لکھ دینا تھا
کوئی ایسا کہ مرے درد گھٹانے لگ جائے

دیکھ کر صبحِ مقدس کے نظاروں کو سعیدؔ
دل ، پرندے کی طرح شور مچانے لگ جائے





سانسوں سے سارا زنگ اتارا نہیں گیا
سو ، آئنوں کو مجھ سے اجالا نہیں گیا

موسم ہے کون سا ذرا گُل چیں سے پوچھیے
پتے تو جھڑ گئے ہیں پرندہ نہیں گیا

گوندھا تھا گرچہ مٹی کو ، بے شک خمار میں
اس پر بھی مجھ سے چاک گھمایا نہیں گیا

حیرت کی بات ہے کہ زمانے کے وار سے
زخمی تو ہو گیا ہوں پہ مارا نہیں گیا

تم کہ اداس ہو کے زیادہ نکھر گئے
مجھ سے تو اپنا آپ سنبھالا نہیں گیا

کوشش کے باوجود بھی تنہائیوں کا دوست!
اندر سے میرے ، شور شرابہ نہیں گیا

یوں تو بہت اداس تھا لیکن یقین جان
مجھ سے ترے فراق میں رویا نہیں گیا





سمندر سا رواں رکھا ہے مجھ کو
محبّت نے جواں رکھا ہے مجھ کو

ازل سے تا ابد پھیلا ہوا ہے
وہ جس نے درمیاں رکھا ہے مجھ کو

کوئی حکمت بِلا شک اس میں ہو گی
تجھے شعلہ، دھواں رکھا ہے مجھ کو

مجھے اپنا بدن ملتا نہیں ہے
بتاؤ تو، کہاں رکھا ہے مجھ کو؟

کسی اپنی اداسی نے ازل سے
نصیبِ دوستاں رکھا ہے مجھ کو

شفق زادی کی آنکھوں نے مبشّر
سعیدؔ ایسا کہاں رکھا ہے مجھ کو؟





جانے کس شہر سے یہ ہجر ستارا لے کر
ہم کہ بازار میں آئے ہیں خسارا لے کر

دھوپ نکلی ہے تو یادیں بھی نکل آئیں گی
سرد جذبوں سے رہائی کا اشارا لے کر

جب سرِ خواب سرا وجد کا عالم تھا میاں!
زندگی لوٹ گئی، نام تمھارا لے کر

رُوبرو آنکھ کے دریا جو تھا ویرانی کا
دشت بھی آئے تو حیرت کا سہارا لے کر

زندگی ہم نے شبِ غم میں گزاری ہے سعیدؔ
رت جگے سینچ کے خوابوں کا خسارا لے کر



غیب کے دشت میں ہوتے ہیں ٹھکانے میرے
بیٹھی رہتی ہے سدا یاد سرہانے میرے

رات آتے ہی اگر نیند سفر پہ نکلوں
مجھ سے ملتے ہیں کئی خواب پرانے میرے

وقت بے وقت کے رونے کا نتیجہ ہے کہ اب
زنگ آلود ہوئے آئنہ خانے میرے

مجھ کو معلوم نہیں ہے شبِ فرقت کی قسم
کس طرح ختم کیے اشک خدا نے میرے

ہے جو اِک پیڑ اداسی کا مرے آنگن میں
وہ مجھے روز سناتا ہے فسانے میرے

مجھ کو تنہائی سرِ شام بتاتی ہے سعیدؔ!
کیسے گُم گشتہ ہوئے سارے زمانے میرے





خواب جانا ہے یا خوابوں کا سفر جانا ہے
ہم نے جانا ہی نہیں، تجھ کو اگر جانا ہے

دن نکلتے ہی نکل آتے ہیں گھر سے باہر
شام کو سوچتے رہتے ہیں، کدھر جانا ہے

ایسا لگتا ہے کسی ہجر زدہ لمحے نے
اشک بن کر مرے چہرے پہ بکھر جانا ہے

اس اذیت سی اذیت بھی کوئی ہو گی بھلا
شہر والوں نے مجھے شہر بدر جانا ہے

اس نے گر ہاتھ چھڑانے کا ارادہ باندھا
میں نے جینے کی اذیت سے مکر جانا ہے

رات کی گود میں سوئے ہوئے لوگوں نے سعیدؔ
نیند میں خواب کی تحریک سے ڈر جانا ہے



جہاں جہاں پہ محبّت دھمال ڈالتی ہے
وہاں وہاں سے قلندر نکلنے والے ہیں

اذان دیتا ہوا آ رہا ہے حضرتِ عشق
سو ہم بھی اپنی صفیں ٹھیک کرنے والے ہیں



بہت فضول سی باتوں کا شور ہوتا ہے
جہاں بھی جاتا ہوں لوگوں کا شور ہوتا ہے

یہ میرے خواب کی بستی عجیب ہے جس میں
تمام رات ہواؤں کا شور ہوتا ہے

یہ کیا دیار کوئی خواب زار ہے، جس میں
جدھر بھی جاؤں پرندوں کا شور ہوتا ہے

وہاں پہ دیپ جلانا محال ہو شاید
جہاں پہ تیز ہواؤں کا شور ہوتا ہے

کبھی کبھار میں جنگل سے جب گزرتا ہوں
ہر اک جگہ پہ درختوں کا شور ہوتا ہے



عجب طرح کے سوالوں کا جال باقی ہے
مرے جنوب میں کتنا شمال باقی ہے؟

ابھی فقیر نے حجرے سے منہ نکالا ہے
ابھی وجود کی ساری دھمال باقی ہے

میں اپنے آپ سے اکثر سوال کرتا ہوں
ترے عروج کا کتنا زوال باقی ہے؟





میری آنکھوں سے جو اشکوں کی نموداری ہے
یہ ترے ہجر کے موسم کی اثر کاری ہے

پاس بیٹھے ہوئے آنکھوں نے اسے دیکھا تھا
مجھ پہ اب تک اسی حیرت کی فضا طاری ہے

باغ میں اشک نہیں پیڑ لگائے میں نے
یہ بچھڑنے سے ذرا پہلے کی تیاری ہے

میں جو کرتا ہوں ترے ساتھ عداوت کھل کر
یہ بھی دراصل محبّت کی طرف داری ہے

بچ نکلنا تو مرا نام ڈبو دے گا سعیدؔ
عشق میں نام کمانا ہی سمجھ داری ہے



وحشتِ عشق کی توقیر بڑھانے کے لیے
ترک دریا کو کیا ، دشت کی بیعت کر لی

جو بھی آتا ہے یہی پوچھنے لگ جاتا ہے
میں نے کیوں ہجر میں یہ میری سی حالت کر لی؟

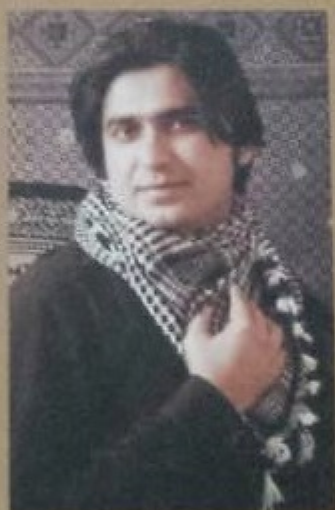
یار کی صورتِ ضوریز کو کل شب میں نے
دور سے دیکھ لیا اور قناعت کر لی

جل پری رقص دکھاتی رہی لہروں پہ سعیدؔ
اور پھر چاند نے پانی میں سکونت کر لی

خواب گاہ میں ریت کی موجودگی پہ یقیناً کئی جہات سے کلام کیا جا سکتا ہے۔ اب کس کے نزدیک کون سا پہلو زیادہ اہم ہے اس کا انحصار دیکھنے والے کے ذہنی رجحان اور زاویۂ نگاہ پر ہے کہ جہاں سے وہ دیکھ رہا ہے، وہاں سے منظر کس طور دکھائی پڑتا ہے۔ مبشر سعید کو اگر اپنے شعری سفر کے پہلے پڑاؤ پہ ہی خواب گاہ میں ریت کی موجودگی کا انکشاف ہو چلا ہے تو بالیقیں یہ اس حوالے سے نہایت خوش آیند ہے کہ اس کے ہاں میں یہ عزم نہایت اہتمام سے موجود ہے کہ ابھی اس نے مزید خاصا سفر کرنا ہے اور اپنے انفرادی اسلوب کی یافت اور اس پہ گرفت کے کٹھن مراحل بھی اسے درپیش ہیں۔ اسی لیے خواب گاہ میں ریت کا ہونا اس کے ہاں مسلسل جست جُو اور خوب سے خوب تر کی تلاش کا نہ صرف اظہاریہ ہے بل کہ یہی پہلو اسے معاصر نوجوان شعرا سے ممتاز بھی کرتا ہے جو کاتا اور لے دوڑے کی روش پر گامزن ہیں۔ ”خواب گاہ میں ریت“، اس کے اب تک شعری سفر کی دستاویز ہے اور اس میں شامل کلام مجموعے کی اشاعت سے پیش تر ہی عوام و خواص میں مقبولیت کی سند حاصل کر چکا ہے۔ اللھم زد فزد۔

حسن نواز شاہ





یہ دور جس میں انسان آوازوں کے دریا میں شانوں تک غرق ہے، زندہ رہنے میں رائیگانی ہی رائیگانی دکھائی دیتی ہے اور ایک زرد اُداسی کھیتوں کھلیانوں تک پھیلی ہوئی ہے، اِس دور میں مبشّر سعید خوابوں کا زادِ سفر لئے، ہجر کی رات کو دیے کی لَو میں باندھے، جادۂ غزل پر گرمِ سفر ہے۔ وہ لفظ کی حرمت کو قیمتِ زر سے نہیں ناپتا۔ اُس کے اندر کا جہاں باہر کی خزاں سے محفوظ ہے۔ یہاں ہر موسم صاحبِ کشف ہیں اور قریۂ سبز سے آتی ہوئی پُرکیف ہوا اپنا جادو جگا رہی ہے۔

فن، مبشّر سعید کے نزدیک، خود فنکار کے عالمِ وجد سے اظہار پر آنے کا نام ہے اور اِس کا ثبوت اُس نے اپنی غزل میں دیا ہے جو اُس کی قلبی کیفیات کا آئینہ ہے۔

حلقۂ شعر سے گزرا ہوں محبت میں سعید
اپنے جذبات کو الفاظ میں لاتا ہوا میں

خورشید رضوی

۳۰ جنوری ۲۰۱۶ء

